ریاض لطیف

نظمیں اور غزلیں

وَینس

پہنا کے زنجیر آبی نباتات کی
اب بھی جکڑے رکھا پانیوں نے۔
نفس میرا پانی،
مری روح پانی،
مرے عکس کی لہر در لہر سطحوں میں
سیّال پتوار کھولے ہیں
در اور دریچوں کی تاریخ نے۔
مرتعش مرتعش
اپنی پھیلی رگوں کی فراوانیوں میں
بہتا ہوں میں
نغمہ زن کشتیوں کے چراغ۔
آسمانوں کا آئینہ سر پر لیے
پھڑ پھڑاتے کبوتر کی دس لاکھ حیرت بھری
سرخ آنکھوں سے چکرا کے
گرتے ہوئے سب کلیسا محل اور فندق کے
سبز اور آلودہ محراب و گنبد بھی پانی۔

عیاں میرے سینے کی سیّال پہنائیوں میں
صحن تا صحن فاختاؤں کے شہپر
تمدّن کے تیور
ہَوا کے ستوں درستوں سارے پیکر۔
گھلے ہیں زمانوں سے پانی کی گلیوں میں
تاجر جہازوں کے زرخیز پھیرے۔
مگر ساری آرائشوں میں سما کر
سرابوں کی موجوں کے غیبی تھپیڑوں نے
پل پل نکھارا ہے بوسیدہ چہرے کو میرے۔
تو اپنے ہی نم اور خوابیدہ سایوں کے
افسانے کہتے ہوئے اب
مسلسل روانی کے کاندھوں پہ
رہتے ہوئے اب
تغیر کا طوفاں اٹھاؤں تو کیا ہو؟
تری آنکھ میں ڈوب جاؤں تو کیا ہو؟

تین نمبر کی گلی میں چڑیا کی قبر

گر کبھی جاؤ
ذرا آہستہ چلنا
تین نمبر کی گلی میں قبر ہے
چڑیا کی ننھی سی
پروں میں جس کے ہم نے
اپنے بچپن کی اڑانیں دفن کر دی ہیں۔

ابھی تک قبر کی مٹّی ہے گیلی
جس میں ہم لڑکوں کے آوارہ تخیل کا
جہاں سویا ہوا ہے۔
تین نمبر کی گلی کی ٹیڑھی میڑھی سانس میں
پوشیدہ تھے شبّیر کتنے!
ایک تھا شبّیر ڈامو
ایک تھا شبیر پاؤ
ایک تھا شبیر پپی
ایک تھا شبیر می
علیو بدرو اب کہاں ہے؟
کھو گیا ہے ہر کوئی اب
سچی جھوٹی قبر میں
اور تین نمبر کی گلی کے موڑ پر
سونی ہَوا کی آنکھ میں
کھوئے ہوئے چہرے بھٹکتے ہیں
کہ جن کے دائرہ در دائرہ حلقوں میں
چڑیا کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ
دور تک آتی ہے مجھ سے ملنے
اپنی قبر سے باہر۔

گائے

گھاس کے سبز میدان تو رہ گئے ہیں
فقط خواب میں۔

میرا بھاری بدن
چار پیروں کی تحریک پر
اٹھ کے چل تو پڑا ہے
اِن آوارہ گلیوں کی انگڑائیوں میں،
مگر شہر کی دوڑتی پھرتی سانسوں سے
ٹکرا کے مسمار ہونے لگی ہے مری ہر اُدا۔
اب تو آوارہ گلیوں کی پرچھائیں میں
مکھیاں شوق سے کر رہی ہیں زنا
میری مغموم آنکھوں کے افلاک پر۔
اپنی دم کو ہلا کر کروں جب تلک
ان کی ٹیڑھی اڑانوں کو سیدھی، بتا؟
راستوں پر بھٹکتے ہوئے اس لیے
روح کی پرورش کے لیے
دو جہانوں کے کاغذ کو
منہ میں مسلسل چباتی ہوں میں۔
ساری امّت کی ماں بن کے
اپنے ہی پھیلاو میں بیٹھ جاتی ہوں میں۔
اب کہ جب مجھ کو ماں ہی بنایا گیا ہے تو پھر
اس مقدّس بدن میں جو گھر کر گئے ہیں
اُن اندھے صحیفوں سے نکلے ہوئے
دودھ کے چند قطرے پیو!
اور اپنے سرابوں کی گہرائیوں میں جیو۔

غزل

مستقل سرابوں کی داستان کہنے تک
ہم بھی تجھ میں زندہ ہیں پیاس بن کے رہنے تک

ماورا سمندر ہم، اور تو کہاں جاتے؟
آنکھ آنکھ سمٹے ہیں، خود سے دور بہنے تک

اپنی پائیداری کو منتشر ہی رکھا ہے
اِس دوام کی مٹّی بے ثبات رہنے تک

چاک پر رکھیں گے اب بحر و بر کی دھڑکن اور
دل نئے بنائیں گے تیرے زخم سہنے تک

ذرّہ بن کے ٹھہرے گا فاصلوں کا سرمایہ
اے ریاض رک جاؤ اِس خلا کے ڈھنے تک

غزل

کنارہ کنارہ در کنارہ مستقل منجدھار ہے یوں بھی
مرے پانی میں جو کچھ ہے وہ پراسرار ہے یوں بھی

بہا جاتا ہوں اکثر دور لمحوں کے حصاروں سے
مرے ٹھہراو کی آغوش میں رفتار ہے یوں بھی

کہاں خلیوں کے ویرانوں میں اس کو ڈھونڈنے جائیں
زمانوں کا سِرا میرے سِرے کے پار ہے یوں بھی

خلائیں، کہکشاں، آسماں، سیارگاں، تارے
مرے ہونٹوں پہ جو کچھ ہے وہ سب مسمار ہے یوں بھی

یہاں سے یوں بھی اِک تجرید کی سرحد ابھرتی ہے
اور اپنے درمیاں انفاس کی دیوار ہے یوں بھی

ہمارے گنبدوں کی گونج کا چہرہ نہیں تو کیا؟
جو تجھ سے کہہ نہیں سکتے، پسِ اظہار ہے یوں بھی

رہا کیا فرق اندر اور باہر میں ریاض آخر؟
جو مجھ میں کھو چکا ہے، مجھ سے وہ سب پار ہے یوں بھی